SHNAKHAT E(ISSN) 2709-7641, P(ISSN) 2709-7633
Vol:3, ISSUE:3 (2024) PAGE NO: 193-200
Publishers: Nobel Institute for New Generation
http://shnakhat.com/index.php/shnakhat/index

Cite us here: Zahid Majeed Amjad, & Dr. Mamuna Subhani *. (2024). Cultural and Social Awareness of Nazir Ahmed Sheikh نذیر احمد شیخ کا تہذیبی و سماجی شعور. *Shnakhat*, 3(3), 193-200. Retrieved from https://shnakhat.com/index.php/shnakhat/article/view/340

" Cultural and social awareness of Nazir Ahmed Sheikh
"نذیر احمد شیخ کا تہذیبی و سماجی شعور

Zahid Majeed Amjad[1] Dr. Mamuna Subhani*[2]

PhD Scholar, Dept. of Urdu, Government College University Faisalabad
Associate Professor, Dept. of Urdu, Government College University Faisalabad

Abstract
Nazir Ahmad Shiekh was a well-known and humorous Urdu writer. He was born in India; his work became popular across the entire Indian subcontinent. He had a special talent for using humor to comment on society and everyday life. His writings were not only funny but also thoughtful, making him a beloved figure in Urdu literature. He was linked with the society and his culture, which are visible through his writings. Even today, his work continues to inspire writers and poets in the region. Through his humor and creativity, he made a lasting impact on the culture and literature.

Keywords: Nazir Ahmad Sheikh, Humor, Society, Culture, Everyday life

نذیر احمد شیخ 1911ء میں پٹیالہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام شیخ نور محمد انجم تھا جو کہ پی۔ڈبلیو۔ڈی میں ملازم تھے۔نذیر احمد شیخ جب کالج میں داخل ہوئے تو ادبی محفلوں سے روشناس ہونا شروع ہوئے۔ مہندرہ کالج پٹیالہ کی بزمِ سخن ان کے لیے خاص ثابت ہوئی اور وہ مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ والد کے تخلص انجم سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نذیر احمد شیخ کے خاندان میں شعر گوئی کسی حد تک موجود تھی۔کالج و ہوسٹل میں شعر و ادب کی محفلیں انھیں مزاح نگاری کی طرف راغب کرتی کر گئیں۔ان کی یہ مزاح نگاری جہاں پیروڈی کی شکل میں ملتی ہے۔وہاں تہذیبی و معاشرتی اقدار پر طنز کرتی اور سماج کے ان پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتی محسوس ہوتی ہے۔ جہاں عموماً انسان صرفِ نظر کرتا گزر جاتا ہے۔نذیر احمد شیخ نے جہاں شاعرانہ اُسلوب کے ذریعے پیش کش کی ہے۔وہاں کالم کو بھی اپنی بات پہنچانے کے لیے ذریعہ بنایا ہے۔ان کی مزاحیہ نظموں میں جہاں شعری گونج اپنی انتہا کو چھوتی ہے۔وہاں تہذیبی و معاشرتی شعور کو بھی اُجاگر کرتی نظر آتی ہے۔کالج و یونی ورسٹی کی زندگی گزارنے کے بعد وہ انجینئرنگ کے شعبہ سے

وابستہ ہوئے تو ان کے پاؤں ایسا چکر پڑا کہ عمر بھر زمین گز بنے رہے۔ نوکری کی تلاش میں کراچی، بمبئی، حیدر آباد غرض بر صغیر کا ایسا کوئی شہر نہ تھا جس کی خاک نذیر احمد شیخ نے نہ چھانی ہو۔ جب ان کے تیز رفتار قدموں کے آگے اکنافِ ہند سرنگوں ہو گئیں۔ تو وہ یورپ کی یاترا پر نکل کھڑے ہوئے اور راستے میں جہاں کہیں حسنِ صورت اور حسنِ نظر دیکھا۔ اس کے لیے ایک یادگار نظم چھوڑی۔ یہ ان کے لیے مشہور ہے کہ ان کی سیاحت اور آوارہ گردی میں تمیز کرنا مشکل ہے۔ جدھر منہ اُٹھ گیا چل کھڑے ہوئے اور جب تک کوئی اقتصادی یا کوئی دوسری مجبوری مزاحم نہ ہوتی وہ گیند کی طرح بلا ارادہ مسلسل لڑھکتے رہے۔ ہر چند سفر ان کے لیے وسیلہ ظفر تو نہ بنا لیکن ان کی شاعری میں تہذیبی اور معاشرتی شعور کی چند جھلکیاں ضرور نمودار ہوتی ہیں۔ ان کی شاعری کا یہ وسیع تناظر ان کے مشاہدے کی تازہ کاری اور تحرک کا سبب ہو گیا تھا۔ ان کے ہاں تہذیبی و معاشرتی شعور کے تلازمے زیادہ تر اسی سفر کا پیشِ خیمہ ہیں جو ان کی نظموں میں جاری اپنا اظہار دیتے ہیں۔

1940ء کے آس پاس ان کی شاعری نے اپنے وجود کی اہمیت کو اُجاگر کرنا اور اپنی اہمیت کو خصوصیت کے ساتھ منوانا شروع کیا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ انجینئر تھے اور زندگی کا بیشتر حصہ اُنھوں نے سائنسی فضا میں بسر کیا اپنی افتادِ طبع کے باعث وہ اس سنجیدہ فضا کو بھی ایک خاص زاویہ نظر سے دیکھتے تھے۔ نذیر احمد شیخ خود ہی لکھتے ہیں:

> ''میں نے سائنس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور تمام عمر بسلسلہ روزگار صنعتی اداروں اور کارخانوں سے منسلک رہا۔ اس جدوجہد نے مجھے اپنے وطن کی ادبی دُنیا سے دور رکھا۔ ذوق کی تسکین کے لیے کبھی کبھی شعر کہہ لیتا۔ چوں کہ دل و دماغ پر سائنس اور انڈسٹری مسلط تھے۔ اس لیے مستقبل مزاج سائنس دان کی طرح میں شاعری میں بھی نت نئے تجربات کرتا رہا۔ جب کبھی کسی ادبی محفل میں شعر پڑھنے کا اتفاق ہوا تو یہ ضرور محسوس ہوا کہ میں کسی غیر مانوس طرزِ سخن کا مالک ہوں۔''(1)

یہ غیر مانوس طرزِ سخن شیخ نذیر احمد کی شاعری کا خصوصی پہلو مزاح نگاری تھا۔ جسے اُنھوں نے معاشرے کا اعصابی تشنج دور کرنے کے لیے انتہائی مہارت سے استعمال کیا اور معاشرے کی تہذیبی، معاشرتی اور سماجی قدروں سے نہ صرف خود کو روشناس کر دیا ہے بل کہ مجموعی طور پر ان کے اقدار کے شعور کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ ہمارے ہاں عموماً مزاحیہ ادب کو سنجیدہ ادب کے مقابل ہمیشہ کم تر توجہ ہی ملی ہے اور اسے دوسرے درجے کی چیز قرار دیا گیا ہے۔ بعض ناقدین نے مزاح کو کلاسیکل ادب یا اعلیٰ ادب کا حصہ شمار کرنا معیوب سمجھا ہے اور ایسے ادب کو فنکار کا غیر معیاری اور غیر تہذیبی رویہ قرار دے کر یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ جب کہ فنکار یا شاعر زندگی کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو مزاح وجود میں آتا ہے۔ البتہ یہاں اس بات کو تسلیم ضرور کیا جاتا ہے کہ مزاح کی اس تعریف میں صداقت کا عنصر ہر حال میں موجود ہے۔ لیکن اسے غیر تہذیبی قرار دینا کسی صورت مناسب نہیں۔ حالاں کہ مزاح کا وجود تہذیب، سماج اور معاشرے شعور کو لازم ہے۔

ادب میں طنز و مزاح اور اس کی شائستگی تربیت یافتہ اور تہذیبی ذہن کی مکمل عکاس ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے دوسرے جان داروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس حیثیت کا ادراک بھی انسان کی آفرینش میں شامل ہے کہ وہ ہنسے، مسکرانے او قہقہہ لگانے کا بھی اہل ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ جب زندگی کو کوئی سنجیدہ عمل انسان کے دل ودماغ کو بوجھل اور روح کو گراں بار کر دیتا ہے تو ایک خودرو مسکراہٹ نہ صرف مسرت اور حظ عطا کرتی ہے بل کہ اسے پھولوں کی طرح ہلکا ہلکا اور ہوا کی طرح لطیف بھی بنا دیتی ہے اور یوں وہ زندگی کے لا متناہی اور سپاٹ کارزار میں حصہ لینے کے لیے پھر سے تازہ دم ہو جاتا ہے۔ مزاح جو کہ ہنسی کا بنیادی محرک ہے۔ اس کے لیے یہ دوسرے تمام فنون لطیفہ کے مقابلے میں تحصیلِ مسرت کا زیادہ اہم وسیلہ ہے۔ لہٰذا زندگی میں مزاح کی ضرورت کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ شاعر طنز ومزاح کا سہارا لے کر ماحول کی بے اعتدالیوں اور فرد کی ناہمواریوں پر نظرِ احتساب ڈالتا ہے اور دوسری بات یہ بھی تسلیم ہے کہ انسان، حیوانِ ظریف ہے اور ہنسی ومزاح اور ظرافت انسان کی جبلت میں شامل ہے لیکن ہنسی اور مزاح پیدا کرنے پر قادر نہیں۔

اس ہنسی سے مراد وہ قہقہہ نہیں جو بے بس انسان کے پاگل پن کا ہو یا پھر ظالم اور جابر سلطان کی سفاکانہ نخوت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بل کہ اس قہقہہ سے مراد وہ بے تکلف قہقہہ ہے۔ جو ذرا سی تحریک سے اُبھرتا ہے اور پوری محفل کو اس قہقہہ میں شریک کر لیتا ہے۔ اس قسم کی ہنسی کو تحریک دینے کے لیے ایک خاص قسم کی نشاط مزاجی، کشادہ، فکری اور عالمی نظر کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ جنس صنفِ سخن اتنی ارزاں نہیں کہ ہر کسی کو نصیب ہو جائے یہی وجہ ہے کہ زندگی کے تہذیبی، سماجی اور معاشرتی شعور پر مشتمل سنجیدہ زاویوں کے ناظرین وناقدین اور لکھاریوں کی تعداد ہر دور میں زیادہ ہوئی ہے لیکن اس زندگی کے ان تہذیبی، سماجی اور معاشرتی شعور کے زاویوں کو مزاح کی شکل انتہائی باریک بینی سے پیش کرنے والے ناقدین وناظرین اور لکھاریوں کی تعداد نہ صرف کم ہوتی ہے بل کہ ان کے پیش کردہ ادب کا عموماً وہ مقام بھی نہیں دیا جاتا جس کے وہ اہل ہیں۔ سوائے چند ایک کے۔ اکبر الہ آبادی، راجہ مہدی خان، مجید لاہوری، ظریف لکھنوی کے ساتھ ساتھ نذیر احمد شیخ معدودے چند میں شامل ہیں۔ جن کا ظہور شاذ ونازہی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جب کبھی کسی محمد جعفری، یا محمد سرمدی کا ظہور ہوتا تو زندگی کا تناظر یکسر بدل جاتا ہے۔ مشاہدے کرنے کا زاویہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ کرخت لہجوں کی جگہ ملائم اور نرم مزاجی اپنی جگہ بنا لیتی ہے اور معاشرہ تنی ہوئی ڈور پر چلنے کی بجائے کشادہ اور روشن راستوں پر یوں سفر کرنے لگتا ہے کہ زندگی کی بانہوں میں بانہوں ڈالے، ہنستے مسکراتے تبسم کا لب نظر آتے لگتا ہے۔ نذیر احمد شیخ بھی ان لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے سنجیدہ شعرا میں شامل ہونے کی بجائے مزاح نگار شعرا کی مختصر سی صنف میں کھڑا ہونا پسند کیا اور کسی اذیت ناک ردِّ عمل کو کروٹ دینے کی بجائے ان پر قہقہہ لگانے کا حوصلہ عطا کیا۔ نذیر احمد شیخ نے خالص مزاح کو مکھ روتی بسورتی زندگی کی تھکاوٹ دور کرنے اور تفاخر کا ذاتی احساس اُبھارنے کی بجائے اپنے عجز وانکسار کو اس کی فطری انداز میں نمایاں کیا ہے کہ لوگ ان سے اکتساب مسرت کیے بنا نہ رہ سکے۔ نذیر احمد شیخ نے اسی مزاح میں تہذیبی، معاشرتی اور سماجی شعور کو پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

؎ کیوں نہ مہماں کو ہم کہیں رحمت
گھر میں امن و مان رکھتا ہے
ایسے دیوار کے بھی کیا ہوں گے
جیسے ہمسایہ کان رکھتا ہے[2]

نذیر احمد شیخ معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی خامی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہی:

ے جب نہ ہو دُنیا میں کام کاج
کیا کریں گے لوگ چوری کے سوا
کچھ نہ چھوڑا شیخ نے مرنے کے بعد
کاغذوں کی ایک بوری کے سو[3]

نذیر احمد شیخ کی زندگی چوں کہ تفاوات کا مجموعہ ہے چناں چہ مشہور ہے کہ ایک شاعر میں جب شعرا کا تعارف ان کے اپنے شعری کارناموں کے حوالہ سے کروایا جارہا تھا کہ توانھوں نے اپنا تعارف نیار نگروٹ کہہ کر کروایا، اُنھوں نے سول سروس کمیشن کے امتحان کی کوشش کی لیکن کامیابی مقدر نہ بن سکی۔ اس ناکامی کے بعد تیزاب کے کارخانے میں منیجر بن کر روزی کمانے کا شرف حاصل کیا۔ کمپنی پر ان کی تنخواہ بوجھ بننے گی تو معمولی تنخواہ پرادنی درجے کا کلرک بھرتی ہوگئے۔ گویہ بارود کے کارخانے میں فورمین بھرتی ہونے کے لیے گئے تو انہائی کم درجے کی آسامی کو قبول کر لیا۔ وہ کچھ بھی ہو معمولی سے معمولی کام کو بھی ہاتھ نہ جانے دیا۔ ان کی تعلیم تو سائنس کی تھی لیکن شعر گوئی کو اپنا مستقبل شغل قرار دیا۔ جب ان کا مجموعہ کلام چھپا تو ناقدین حیرت تھے کہ:

''ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی۔''[4]

اس حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا کا بیان قابلِ غور ہے۔ ملاحظہ ہو:

''پچھلے دنوں نذیر احمد شیخ کی کتاب ''حرفِ بشاش'' چھپی تو مجھے بے حد دُکھ ہوا۔ کتاب کی اشاعت پر نہیں کہ یہ کتاب اُردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ دُکھ اس بات پر ہوا کہ اس سے قبل ان کے کلام سے کیوں آشنا نہ ہوا۔ مجھے اعتراف ہے کہ جب 1958ء میں میرا تحقیقی مقالہ ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' شائع ہوا تو میں نذیر احمد شیخ کے کام تک سے واقف نہ تھا۔''[5]

کبھی زندگی کی کامیابیاں اور کامرانیاں ان کا مقدر بننے لگیں تو وہ ان سے پلو چھڑا کر بھاگ کھڑے ہو جاتے۔ یوں زندگی اور نذیر احمد شیخ برسوں ایک دوسرے کا تعاقب کرتے رہے۔ کبھی زندگی آگے نکل جاتی تو کبھی نذیر احمد شیخ۔ اسے پکڑنے کے لیے سرپٹ دوڑ پڑتے لگتے۔ کبھی نذیز احمد شیخ دبا لیتے تو ہانپتی زندگی ان سے گلو کلامی حاصل کرنے کے لیے کراہنے لگتی۔ زندگی کے تضادات کی یہ آنکھ مچولی نذیر احمد شیخ کی شاعری کا پسِ منظر بھی ہے اور پیش منظر بھی۔ ان کی شاعری نے معاشرتی تضادات کو تخلیقِ مزاج کا ذریعہ بنا دیا ہے اور اس انداز مزح کے انداز میں وہ تہذیبی، معاشرتی اور سماجی رویوں کے شعور کو بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کی معاشرتی اور سماجی اقدار کیسے تہذیبی و ثقافتی عکاس ہوتی ہیں اس کا اندازہ ذیل کی مثالیوں لگایا جا سکتا ہے:

ے مولوی صاحب چلے ہیں پیش پیش
پھر کوئی زیر و زبر لانے کو ہیں
چھوڑیے یہ الحفیظ و الاماں
ورنہ ہم المختصر لانے کو ہیں
نصف روٹی، ایک بوتل، دو کباب
ما بدولت ماحضر لانے کو ہیں[6]

دوسری مثال ملاحظہ ہو:

ے بھینس اپنا سر ہلاتی ہے کہ میں سمجھی نہیں
کیسے پیدا ہو رہا ہے دودھ گھی کا مسئلہ
الحذر سے رند بادۂ خوار ناکار ہوا
الکحل سے حل ہوا کچھ کاہلی کا مسئلہ
کھینچی ہے اک طرف تہذیب حاضر کی کشش
اک طرف دامن کشاں ہے مولوی کا مسئلہ[7]

ان کی مزاح نگاری کا ایک رشتہ قدیم مزاحیہ شعرا سے استفادہ پر مشتمل ہے تو دوسری طرف وہ انگلستان میں قیام پذیر رہنے کی وجہ سے مغربی ادا اور مزاح، تہذیب و ثقافت، معاشرت و سماج کے شعور سے بھی واقفیت حاصل کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نظیر اکبر آبادی، اکبر الہ آبادی او دیگر بزرگ معاصرین کے کلام کی پر چھائیاں ملتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی مزاح نگاری کا پیمانہ اسی سبب انگریزی صنفِ نظم ''لمرک'' سے بھی مبرا ہے۔ نذیر احمد شیخ کی خوبی یہ ہے کہ اُنہوں نے معاشرے کی ناہمواریوں کا عمیق مشاہدہ کیا ہے اور ان ناہمواریوں کو مبالغہ کا غبارہ نہیں بننے دیا بل کہ تاثر کی آنچ کو دھیما رکھنے کے لیے ان ناہمواریوں کو سادگی اور معصومیت سے بیان کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں معاشرتی بوالعجبی کا شکار ہونے والے کرداروں سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور سیاسی و سماجی معاشرتی نفسیاتی اور تہذیبی و سماجی شعور کا برملا اظہار شاعرانہ طور پر کر دیا ہے۔ دیکھا جائے تو نذیر احمد شیخ ہمارے سامنے ایک مبصر کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ جو انبوہ میں مسلسل دھکے کھا رہا ہے لیکن اپنا رواں دواں تبصرہ بھی بیان کیے جاتے ہیں۔

اقتباس کے لیے ان کی نظمیں ''ریلوے جنکشن''اور ''زمیندار بس'' کے چند بند ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں:

ـــ دل پر اک بوجھ ہے اسبابِ قلی کے سر پر
سیم وزر، زیور کمخواب قلی کے سر پر
ہر نظر مضطر و بے تاب قلی کے سر پر
اور قلی بیقرار ہر آن بدل جاتا ہے

ـــ آپ نکلے کہ گریبان نکالے کوئی
کس طرح بھیڑ سے ساماں نکالے کوئی
ڈان اخبار کسی کا ہوا اُٹھا لے کوئی
ہیر سے ہیر کا دیوان بدل جاتا ہے

ـــ گر کبھی بھیڑ بھیڑ کسے سے نکل بھی جائیں
کوٹ کی جیب سے بٹوے کو اندر دبائیں
دوڑ کر اب جو سپاہی کو بلا کر لائیں
واپسی پر کوئی سامان بدل جاتا ہے

ـــ لاکھ محتاط رہیں، کس کس کی بچائیں ٹکر
کبھی آگے، کبھی بائیں، کبھی دائیں ٹکر
ناگہاں اک بت کافر سے جو کھائیں ٹکر
شیخ صاحب کا تو ایمان بدل جاتا ہے[8]
(ریلوے جنکشن)

اب ذرا کچھ بند ”زمیندار بس“ کے بھی ملاحظہ ہوں۔ جن سے بخوبی نذیر احمد شیخ کے مزاح میں تہذیبی و سماجی و ثقافتی اور معاشرتی شعور کو بخوبی پرکھا جاسکتا ہے۔ ذیل کی قطاریں بڑی عمدگی سے اس شعور کو پیش کرتی نظر آتی ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

ـــ یہ سروس زراہ ہوس چل رہی ہے
زمیندار بستی کی بس چل رہی ہے
جھکولوں سے جب کارواں جھولتا ہے
مسافر مسافر کا منھ چومتا ہے

پھسلتا پھر ہوتا ہے، سر گھومتا ہے
دل نبض ساکت ہے نسل چل رہی ہے
زمیندار بستی کی بس چل رہی ہے

عجب موڑ موڑی، عجب جھوک لی ہے
کہ بمپر میں چھکڑوں کی دم ٹھوک لی ہے
پولیس کے جواں نے جو اب روک لی ہے
نہ بس چل رہا ہے ، نہ بس چل رہی ہے
زمیندار بستی کی بس چل رہی ہے(9)

(زمیندار بس)

درج بالا بندوں سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نذیر احمد شیخ نے ''ریلوے جنکشن''اور''زمیندار بس'' کے مسافروں کی ہیئت کذائی کو کس خوبی سے تنقید بدلہ کے لیے استعمال کیا ہے۔ جو ان کے تہذیبی و سماجی اور معاشرتی شعور کی عکاسی کرتا ہے۔ نذیر احمد شیخ ان لوگوں میں سے تھے جن میں زندگی اتنی مہربان نہ تھی کہ انھیں ہر میدان میں کامیابی سے ہم کنار کرتی۔ بل کہ نذیر احمد شیخ کو اپنی زندگی میں جن حالات و واقعات سے واسطہ پڑا۔ وہ انسانی زندگی کو تلخ کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ اگر نذیر احمد شیخ اپنی پے درپے ناکامیوں پر بیٹھ کر روتا روتے ہوئے قنوطیت کی تاریکیوں میں خود کو روپوش کر لیتے تو شاید وہ اس تہذیبی و سماجی شعور سے آگاہی نہ کر پاتے جن کا ادراک ان کی شاعری کی تفہیم سے ہوتا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی اور نہ وہ اتنے عمدہ مزاح نگار کے طور پر سامنے آتے۔ چوں کہ وہ ایک مزاح نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے ہیں۔ جس سے ان کے باطن میں ایک صحت مند فنکار کی روح پرورش پر ورش پاتی رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے کامیوں پر آنسو بہانے کی بجائے ان پر بے اختیار ہنسنا شروع کر دیا۔ اس مقام پر قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان کی ہنسی میں غم کا شائبہ تک نہیں ہوتا اور اُنہوں نے کبھی اپنے آنسوؤں سے چراغ جلانے کی ناکام کوشش بھی نہیں کی بل کہ وہ اس نامرادی کی حالت میں ہمیشہ اُمیدوں کے چراغ روشن کرتے نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات

نذیر احمد شیخ، کلیات مزاحیہ شاعری، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، 2001ء ص:120
نذیر احمد شیخ، کلیات مزاحیہ، ص:153
ایضاً، ص:160
ایضاً، ص:12

وزیر آغا، ڈاکٹر، مضمون: طنز ومزاح کے پچیس سال، مشمولہ: افکار، جوبلی نمبر، کراچی

نذیر احمد شیخ، کلیات مزاحیہ، ص:161

ایضاً، ص:114-115

ایضاً، ص:92، 100، 101

ایضاً، ص:120